Journal of Applied Linguistics and TESOL (JALT)
Vol. 7 No. 4 (2024)

جدید سرائیکی نظم میں سندھ وادی کارومانس

Romance of Indus Valley in Modern Saraiki Poetry

Riaz Hussain Khan Sindher
Assistant Professor, Department of Siraiki, The Islamia University of Bahawalpur
riazsindher@gmail.com
Muhammad Arif
Lecturer, Saraiki Area Study Centre, Bahauddin Zakariya University, Multan
arifrajwana@gmail.com

Abstract:
The Saraiki region is the central part of the Indus Valley. The people of the Saraiki region have been the victims of attack and exploitation by foreign invaders and usurpers for centuries. This attack and exploitation has given them nothing but a sense of deprivation and inferiority. When Harappa and Mohenjo-Daro were excavated by the Department of Archeology during the British era, it gave a sense of pride to the people here and thus the beauty of the Indus Valley, its ancient monuments and its rivers became the romance of the people of this region. The excavations of these archaeologists gave the people of the Indus Valley a pleasant feeling and pride that they are not inferior creatures from outside, but they are the original heirs of this great civilization. It was a great feeling. This realization opened new doors of knowledge and literature. This feeling changed the aesthetic of the poetry of the Saraiki region. From local metaphors, similes and symbols, that artistic and intellectual beauty was born in Saraiki poetry, which made Saraiki poetry equal to the best poetry in the world.In Saraiki Modern literature, Saraiki poetry has widened the meaning and scope of Romanticism. Modern Saraiki poetry has its own Romanticism. This new Romanticism in Saraiki literature has its own romantic elements. Among these elements, the romance of Indus Valley is very prominent in the poetry of modern Saraiki poetry particularly in the genre of modern poem. In the article, an overview of the romance emerging from these excavations will be presented in the way the Saraiki poets have appreciated and celebrated it in their poems.

Key words:
Indus Valley, Romanticism, Modern Saraiki poetry, Harappa and Mohenjo-Daro

سندھ وادی کا شمار دنیا کی چار بڑی اور قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی باقی بڑی تہذیبوں میں مصر، میسوپوٹیمیا اور چین کی تہذیبیں شامل ہیں اور ان تہذیبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دریاؤں کے کناروں پر پروان چڑھیں۔ میسوپوٹیمیا کی تہذیب دجلہ و فرات کے کناروں پر پلّی بڑھی، مصر کی تہذیب دریائے نیل کے کناروں پر پھلی پھولی اور چین کی تہذیب کو دریائے زرد نے پروان چڑھایا۔ سندھ وادی دریائے سندھ اور دریائے ہاکڑہ کے کناروں پر پروان چڑھی۔ سر مور ٹیمر وھیلر اپنی کتاب میں سندھ وادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "ارتقایافتہ شہری کے زندگی کے ابتدائی دور کا آغاز ہمالیہ کے نیچے کے خطّے میں ہُوا۔ اپنؓی اوّلین اور وسیع ترین جائے وقوع کی بنا پر اس تہذیب کا نام وادئ سندھ کا تمدن پڑا۔"(۱)

سندھ وادی قدرتی وسائل اور حسن سے مالامال وادی تھی۔ جس کی وجہ سے سندھ وادی پر ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں نے حملے کیے، ظلم کے بازار گرم کیے اور بے دردانہ طریقے سے قتلِ عام کیا، یہاں کے وسائل کو لُوٹا اور مقامی باشندوں کوں اپنا غلام بنایا، انہیں ان کی دھرتی سے بے دخل کیا۔ سندھ وادی کے قدیم اور اصل باشندوں کوں ان بیرونی حملہ آوروں نے نہ صرف ان کے وسائل سے محروم کیا بلکہ ان کے اندر احساس محرومی اور احساسِ کمتری کا زہر بھی گھول دیا۔ ان بیرونی حملہ آوروں میں دراوڑ، آریا، اسوری، یونانی، عرب، ایرانی، افغانی اور انگریز سب شامل رہے ہیں۔ ان بیرونی حملہ آوروں نے ان مقامی اور اس وادی کے اصل باشندوں کو شودر اور راکھشس کہا۔ ان سے ان کا ہر احساسِ تفاخر چھین لیا۔ ان کے طرز حیات اور طرز فکر کو فرسودہ اور جاہلانہ قرار دیا۔ اس وجہ سے سندھ وادی کے مقامی باشندوں کے اندر خوف، ڈر اور کبھی نہ ختم ہونے والی اداسی ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی۔ مقامی باشندوں کا یہ احساس محرومی اور احساسِ کمتری ہمیشہ کے لیے ان کی ترقی کی راہ میں سدِراہ بن گیا۔ جب کسی تہذیب کے لوگوں میں احساس محرومی اور احساس کمتری بڑھ جائے اور ان کے اندر اپنی تہذیب اپنی دھرتی اور سورماؤں کے حوالے سے احساس تفاخر باقی نہ رہے تو ایسی قومیں

بڑی مشکل سے اقوامِ عالم میں اپنی شناخت اور اپنا کوئی مقام بناتی ہیں۔ آثاریات اور آثارِ قدیمہ کی دریافت کسی بھی قوم کی شناخت اور توقیر کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شیخ نوید اسلم لکھتے ہیں کہ:

"آثاریات، تاریخ کا ایک اہم اور ضروری ماخذ ہے۔ کسی بھی ملک، خطے، علاقے میں موجود ٹیلے، بھٹ، قدیم قلعے اس کی تاریخی ورثہ اور تاریخ کی ان کہی گم شدہ کڑیاں ملانے کا اہم وسیلہ ہوتے ہیں۔ جس علاقہ، خطے، ملک میں یہ ٹیلے موجود ہوں وہ جتنے بھی قدیم ہوں ہوں گے اتنے ہی زیادہ اہم اور اس خطے کے لوگوں کی تہذیبی تسلسل کو اپنے اندر پنہاں کئے ہوئے ہونگے اور یہ ٹیلے اس ملک کے لیے تہذیبی خزینہ اور تاریخ کا ماخذ بن جاتے ہیں۔"(۲)

سندھ وادی کے لوگوں کو ان کے احساس کمتری سے نکالنے اور انہیں احساس تفاخر دلانے میں اہم ترین واقعات وہ کھدائیاں ہے جو انگریز دور میں ان کے قائم کردہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے کی اور اس خطے کے لوگوں کو اس بات کا شعور دیا کہ یہاں کے اصل باشندے جس تہذیب اور تمدن کے وارث ہے وہ تہذیب اور تمدن اُن بیرونی حملہ آوروں کی تہذیب اور تمدن سے کسی بھی طرح سے کم نہیں تھی اور ان کی تہذیب بھی اپنی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے اُن تہذیبوں کے ہم پلہ تھی۔ سرائیکی خطہ اس سندھ وادی کی تہذیب کے مرکزی علاقوں پر مشتمل ہے۔ سرائیکی خطے ان حملہ آوروں کی حملہ آوری، قتلِ عام اور لوٹ کھسوٹ کا سب زیادہ نشانہ بنا۔ اس خطے کے مقامی باشندوں کے ساتھ جو سلوک ہوا اُس نے اس خطے کے باشندوں کو بھی ہر طرح کے احساس تفاخر سے محروم کیا اور ان کے اندر احساس کمتری پیدا کیا۔ کئی صدیاں کی حملہ آوری، ظلم وجبر اور استحصال سے پیدا ہونے والی احساس محرومی اور احساس کمتری کے بعد اس خطّے کے لوگوں کو جو پہلا احساس تفاخر(Pride)ملا۔ اس کا سہرا سر جان مارشل، جنرل کننگھم، آر۔ڈی۔ بنرجی، ڈی۔ آر۔ ساہنی اور رفیق مغل جیسے ماہرین آثارِ قدیمہ کے سر ہے۔ جنہوں نے اس خطے کے لوگوں پر آشکار کیا کہ وہ کوئی شودر، راکھشس اور غیر مہذب نہیں ہیں۔ بلکہ وہ خود ایک قدیم اور عظیم تہذیب کے وارث ہیں۔ یہ اس خطّے کے لوگوں کا پہلا رومانس ہے جس کا اظہار نہ صرف یہاں کے سرائیکی دانشوروں اور لکھاریوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے بلکہ اس خطے کے سرائیکی شاعروں نے اپنی نظموں میں خاص طور پر اسے Celebrate کیا۔ جدید سرائیکی شاعری میں نظم وہ صنف ہے جس میں سرائیکی نظم گو شاعروں نے سندھ وادی اور اس کے دریاؤں خاص طور پر دریائے سندھ کے ساتھ اپنے رومان(Romance) کو اپنی نظموں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ "دریا سندھ" سرائیکی نظموں کا ایک بہت بڑا موضوع بن کر سامنے آیا ہے۔ اس رومان کی ابتداء اور اصل وجہ مذکورہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی وہ کھدائیاں ہیں جن سے ہڑپہ، موہنجو داڑو، ملتان، جلیل پور اور گھنویری والا سے مختلف آثار برآمد ہوئے ہیں۔ ان آثار اور انکشافات کا کریڈٹ(Credit) اُن ماہرینِ آثار قدیمہ کوں جاتا ہے جنہوں نے اس خطے میں آثار قدیمہ کی دریافت کے لیے مختلف مقامات پر کھدائیاں کیں۔ اس سے پہلے سندھ وادی کی اس تہذیبی قدامت سے دنیا اور خاص طور پر یہاں کے مقامی باشندے آشنا نہیں تھے۔ اکرم میرانی اپنی سرائیکی وسیب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"وادی سندھ، سرائیکی وسیب جس کا ایک حصہ ہے، یہ دنیا کی پرانی ترین تہذیبوں میں سے ہے، سرائیکی وسیب اس وادی کا مرکزی حصہ ہے۔ اس بات کا ثبوت آثار قدیہ کی وہ تحقیقات ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ اس دھرتی میں ہاکڑہ تہذیب جیسی بڑی تہذیب ایک زمانے اپنے عروج پر رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ جلیل پور، گنویری والا اور ملتان ہمارے وہ علاقے ہیں جو ہمارے وسیب کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کچھ چھپا کے کھڑے ہیں۔(۳)

اسی طرح سے ان کھدائیوں کے حوالے سے ڈاکٹر عتیق انور صدیقی لکھتے ہیں کہ:

"ہڑپا اور موہن جو داڑو کی دریافت ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ شہروں کی دریافت کے سلسلے میں کھدائی کا کام جان مارشل(John Marshal)کے زیر نگرانی شروع ہوا تھا۔ اور اس وقت اس دریافت کوں بیسویں صدی کا سب سے اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔"(۴)

سر جان مارشل وہ پہلا بندہ ہے جس نے سرائیکی تہذیب کو پانچ ہزار سال کی عظمت وقدامت پہ جا کھڑا کیا ہے۔ جس کے ساتھ سرائیکی وسیب کے لوگوں کے لئے نئے در وا ہوئے ہیں۔ جس کے ساتھ یہاں کے لوگوں نے خود کو دوبارہ محسوس کیا ہے کہ وہ بہت وسیع اور بہت قدیم تہذیب کے وارث اور مالک ہیں۔ سر مور ٹیمر کے مطابق:

"۱۹۲۱ء کے سر جان مارشل اور ان کے ساتھیوں نے جو آثار دریافت کیے اُن سے ہندوستان کو ما قبل تاریخ عہد کے تقریباًدو ہزار زریں سالوں کا اضافہ حاصل ہو گیا اور دنیا کو اس کی تین قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک سب سے بڑی تہذیب کا علم ہوا۔"(۵)

۱۹۲۱ء کے اس سال جب موہنجو داڑو اور ہڑپہ دریافت ہوئے، کھدائیاں ہوئیں، اس سے پہلے یہاں کے لوگ ڈیڑھ ہزار سال پرانی تہذیب کی تاریخ پر کھڑے تھے۔ یہ سر جان مارشل تھے جنھوں نے اس خطے کے لوگوں کو نئی آنکھ دی۔ جس سے یہاں کے انسان نے دنیا کو، کائنات کو اور اپݨے آپ کوں نئے سرے سے دیکھا۔ اس سے نہ صرف سرائیکی وسیب کو بلکہ پوری سندھ وادی کی تاریخ اور تہذیب کو ہک توقیر ملی۔ اس کے آرٹ کی بنیاد میں یہ بات شامل ہو گئی کہ وہ ایک تہذیب بلکہ ایک قدیم تہذیب کے وارث ہیں۔ اس احساس سے یہاں کے آرٹ میں ہک نئیTransformation آئی۔ خواجہ غلام فرید کے عہد تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس وسیب کا آدمی اتنی قدیم تہذیب کا وارث ہے۔ گو خواجہ غلام فرید کے پاس ایک چیز موجود تھی جو اُن کے مطالعہ اور علم میں تھی جو کہ آج کے بندے کے مطالعہ میں بھی نہیں ہے، وہ بات یہ تھی کہ خواجہ غلام فرید نے وید پڑھ رکھے تھے۔ وید بھی سندھ وادی کے انسان کو کم از کم دوڈھائی ہزار سال پیچھے لے جاتے ہیں۔ ویدوں کو ۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۲۰۰ قبل مسیح کے درمیان کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈھائی ہزار سال کی تاریخ تو ویدوں نے بھی بنائی ہوئی تھی۔ موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی دریافت کے بعد یہاں کے انسان کا تہذیبی ورثہ پانچ ہزار سال پیچھے چلا گیا۔ خواجہ غلام فرید کے پاس قدامت کا ایک تصور موجود تھا جو انہیں ویدوں کے مطالعے سے حاصل ہوا تھا لیکن قدامت کے اس تصور کا احساس اپنی جگہ پر، لیکن یہ قدامت خواجہ کی شاعری میں منعکس (Reflect) نہیں ہوئی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تہذیبی تصور اور احساس جو قدامت کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ سرائیکی کلاسیکل شاعری میں نہیں ہے۔ سرائیکی کلاسیکل شاعری میں وسط ایشیاء کے شاعروں اور فلسفیوں کے تصورات اور فلسفے موجود ہیں۔ یہ ایرانی صوفیاء کے خیالات کے رومان پر کھڑی شاعری ہے۔ اس کے مقابلے میں جدید سرائیکی شاعری(Modern Siraiki Poetry)تو تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے بہت آگے چلی گئی ہے۔ جدید سرائیکی شاعروں کے پیروں کے نیچے زمین ہے۔ خواجہ غلام فرید کے پیروں کے نیچے بھی زمین ہے۔ انہوں نے بھی زمین کی دریافت کی ہے۔ خواجہ غلام فرید نے کمال یہ کیا ہے کہ وہ تصوف جو کہ سارے کا سارا فلسفہ ہے، خواجہ غلام فرید نے اس فلسفے کوں روہی کی دھرتی پر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے فلسفے کی تعریف اور توضیح روہی کے ذریعے کی ہے۔ خواجہ غلام فرید کی شاعری کا سارا حسن اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے زمین (Land) کوں پہلی دفعہ Establish کیا ہے۔ یہ اُن کا بہت بڑا کمال ہے۔ خواجہ غلام فرید نے اپنی شاعری میں صوفیانہ خیالات کو زمین(Land) کے ساتھ جوڑا تو یہ کام پہلی دفعہ خواجہ غلام فرید نے کیا۔ یہی چیز انہیں دوسرے صوفی شاعروں سے منفرد کرتی ہے۔ جدید سرائیکی شاعروں نے اپݨی قدامت کے رومانس کوں سر جان مارشل کی دریافت کے بعد کہیں بہت دور لے گئے ہیں۔ یہ سہولت اور فائدہ سرائیکی زبان کے جدید شاعر کو حاصل ہے۔ سرائیکی نیشنل ازم کی پوری موومنٹ کو سب سے زیادہ طاقت اور بنیاد اسی چیز نے مہیا کی ہے کہ وہ ایک بہت ہی قدیم تہذیب کے وارث ہیں۔ اُن کی ایک شناخت ہے۔ آج کا جدید سرائیکی شاعر سندھ وادی کی تہذیب کی شناخت کے ساتھ اپݨی شناخت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس شناخت کا ریکارڈ سرائیکی وسیب کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کوں جن لوگوں نے دیا ہے وہ سر جان مارشل، جنرل کننگھم اور رفیق مغل ہیں ۔

جدید سرائیکی شاعری میں جس صنف نے سرائیکی شاعری کو توقیر بخشی ہے اور جس صنف میں جدید سرائیکی شاعروں نے اعلیٰ پائے کی شاعری تخلیق کی ہے وہ صنف جدید نظم کی صنف ہے جس میں پابند نظم، آزاد نظم، معریٰ نظم اور نثری نظم کی اصناف شامل ہیں۔ ان نظموں میں جو موضوع ایک بہت بڑے رومان(Romance) کے طور پر ابھرا ہے وہ سندھ وادی کا رومان(Romance) ہے۔ جس کا اہم مظہر دریائے سندھ ہے۔ اس رومان کا ہک خوبصورت حوالہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کی تحقیقی کتاب "سرائیکی لوک گیت"•(۱۹۶۴ء)کا انتساب ہے جو یہ تھا:

"دریائے سندھ کی لہروں کے نام"(۶)

بیٹ دریاؤں کے کناروں کی دلدلی اور جھاڑیوں والی زمین کو بھی کہا جاتا ہے، دریائی علاقے اور دو دریاؤں کے درمیان کی زمین کو بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ وادی میں دریا سندھ کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی دریا ہیں جن میں چناب، راوی، جہلم، ستلج بھی ہیں اور ہک گم شدہ ہاکڑہ دریا بھی ہے۔ ان دریاؤں کے بیٹ کا جو حسن اور جو دلکشی ہے اُسے بھی سرائیکی نظم گو شاعروں نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے اور ان کے ساتھ اپنے رومانوی جذبات کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے حسن رضا گردیزی کے شعری مجموعہ "دھابے

دھوڑے"(۱۹۷۹ء) کی نظم "کچا بیٹ "ہک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ جس میں انہوں نے دریائی علاقوں میں صبح کے منظر کی دلفریبی کو درج ذیل انداز میں بیان کیا ہے:

"پار چنھاں دے کچے بیٹ اچ
فجریں کال کڑ چھی بولے
روح دا چین نگاہ دی ٹھاڈل
نتری صاف ہوا دے جھولے" (۷)

اسی طرح سے وادی سندھ کے ان دریاؤں کے بیٹ کے حوالے سے جمشید احمد کمتر رسول پوری کے شعری مجموعہ "سُکھ سو جھلا"(۱۹۹۱ء) کی ایک نظم "بیٹ "میں بیٹ کو پیار کرنے والوں کے لیے ہک مثالی جگہ قرار دیا ہے، جہاں رنگ ہی رنگ ہے، جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور جہاں کی سادہ زندگی میں اپنی ایک کشش ہے۔ اس لیے جمشید احمد کمتر پکے علاقے یعنی شہری علاقے سے تنگ ہو کر اپنے محبوب کے ساتھ بیٹ میں جا کر آباد ہونے اور وہاں رہنے کی خواہش کرتے ہیں:

"پکے توں ھُݨ ساڈی بس اے　　بیٹ ڈٖھیں بس چس ای چس اے
آھُݨ سانول بیٹ ڈٖو ہلوں　　آھُݨ سانول بیٹ ڈٖو ہلوں
وقت نبھیسوں بیٹ دے لئیں وچ　　فرق نہ ہوسی تیں تے میں وچ" (۸)

جمشید احمد کمتر رسول پوری نے بیٹ میں موجود کالے تیتروں، چتر ور، کونجوں اور مشکی موروں کا بھی حوالہ دیا ہے، بیٹ کی بارشوں کا لطف، بیٹ کی ٹھنڈی ہواؤں کا بیان، بیٹ کے علاقے کے دودھ اور لسی کے مزے، غرض بیٹ کی جو باغ بہاریں ہیں اُن کو بہت ہی خوبصورت لفظوں میں نظم کیا ہے۔ یہ سب سندھ وادی کا حسن ہے جسے سرائیکی شاعری نے بڑے فخر کے ساتھ اور جذبات کی گہرائیوں سے Celebrate کیا ہے۔

عاشق بزدار کا شمار سرائیکی زبان کے رومانوی شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "قیدی تخت لہور دے "۱۹۸۴ء میں شائع ہوا، اس شعری مجموعے کی شہرت مزاحمتی فکر کے حوالے سے ہوئی۔ مزاحمتی فکر کے ساتھ ساتھ اس میں سندھ وادی کے تاریخی آثار اور دریاؤں کے ساتھ عاشق بزدار کی وابستگی اور محبت نے اس مجموعے میں موجود رومانوی رنگ کو اور گہرا کر دیا۔ عاشق بزدار نے اپݨی شاعری میں رومانوی شاعری کے مزاحمتی رنگ کے ساتھ سندھ وادی کو ساتھ اپنے رشتے کو بہترین رومانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری اس رشتے کو بہت ہی تخلیقی سطح پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میڈی رَگ رَگ دے وچ وہندن
گھارا، سنگھڑ، سندھ تے چھاچھڑ
اکھیوں لُڑھدی کاک
میڈا اپنج دریاویں نال ہے کیویں رشتہ
سمجھ نیں آندا" (۹)

گھارا سے مراد دریائے گھاگھرا ہے جسے ہاکڑہ اور سرسوتی بھی کہتے ہیں۔ یہ سرائیکی وسیب کا وہ دریا ہے جو سُوکھ گیا ہے اور گم ہو گیا ہے۔ اسی طرح سے سنگھڑ تونسہ کی ندی ہے۔ چھاچھڑ راجن پور کی ندی ہے اور اسی طرح کاک سرائیکی وسیب کے دریائے گھاگھرا سے نکلنے والی ندی ہے جس پر سرائیکی لوک داستان کے کردار مومل کا گھر تھا۔ گھاگھرا کے سوکھنے سے کاک ندی بھی سوکھ گئی اور مومل کا گھر بھی اُجڑ گیا۔ یہ سب سندھ وادی کے رومانوی حوالے ہیں جن سے عاشق بزدار کا رومان بہت گہرا ہے۔

سندھ وادی اور دریائے سندھ کے رومان (Romance) کو جس شاعر نے اپݨی شاعری میں کمال عروج پر پہنچایا وہ جدید سرائیکی نظم کے شاعر اشولال ہیں۔ اُن کی شاعری میں سندھ وادی اور دریائے سندھ کوں جس طرح Romanticize کیا گیا ہے اُس کا شمار دنیا کی بہترین رومانوی شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔ اشولال کی نظموں کا پہلا شعری مجموعہ "چھیڑ وہتھ نہ مُرلی "۱۹۸۹ء میں، دوسرا نظماں کا شعری مجموعہ "گوتم نہ جھیڑا"۱۹۹۵ء میں، تیسرا نظموں کا شعری مجموعہ "کاں وسوں دا پکھی "۱۹۹۷ء میں، چوتھا نظماں کا مجموعہ "سندھ ساگر نال ہمیشاں (پہلا درشن)"۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں انہوں نے اس مجموعے

کے دیباچے "اپݨے قاری نال کجھ ناکھیں وَلا" میں جو کچھ لکھا ہے وہ سندھ وادی کے ساتھ اُن کے اُس رومان کوں ظاہر کرتا ہے جو جدید سرائیکی شاعری میں سرائیکی شاعروں کے ایک بڑے رومان(Romance) کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اشولال لکھتے ہیں کہ:

> "آج بیس برس بعد میں اپنے کام کو اپنے قاری کے ساتھ دوبارہ پڑھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے میں نے ایک ہی نظم دوبارہ دوبارہ لکھی ہو اور یہ ایک ہی نظم ہے۔۔۔سندھ وادی، اس کی آبادی، اس کے دریا، اس کے پرندے، اس کے جانور، اس کے لوگ، اس کی جگہیں، اس کے کھنڈر، اس کا مزاج، اس کا غصہ، اس کی محبت۔۔۔کتنے رنگ ہیں جنہوں نے تاریخ کی اذیت سے گزرنا تھا۔"(۱۰)

اشولال نے اپنی شاعری کا ایک سکیچ خود پیش کیا ہے ہے جس کے مطابق "چھیڑ وہتھ نہ مُرلی" میں جو نظمیں ہیں اُن کا موضوع سندھ وادی کا Festival Culture، سندھ وادی کے باشندے اور سندھ وادی کا حسن ہے۔ "گوتم نال جھیڑا" کی نظماں کا موضوع سندھ وادی کا Cultural Unconscious، اس کا لوک تصوف اور اسکی ·بدھ مت ہے۔ "کاں وسوں دا پکھی" کا موضوع سندھ وادی وادی کی تاریخ، اس کی آبادی اور اس کے آثار ہے۔ "سندھ ساگر نال ہمیشاں" کی نظموں کا موضوع سندھ کے دریا، اس کا لینڈ سکیپ اور اس کے پرندے اور جانور ہیں۔ انہوں نے اپنے آنے والے شعری مجموعے "سندھ ساگر نال ہمیشاں" کے موضوعات میں سندھ وادی کے پربھ، اس کی درگاہیں اور اس کی موسیقی کو شامل کیا۔ یہ مجموعہ "سندھ ساگر نال ہمیشاں"(ڈوجھا درشن)۲۰۱۷ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد بھی اشولال کے دو شعری مجموعے "·ال منوتی"۲۰۲۱ء میں اور "وسارا"۲۰۲۴ء شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں بنیادی فکر سندھ وادی سے وابستہ ہر چیز سے اشولال کی وہی گہری محبت اور وابستگی ہے جو اُن کے گذشتہ تمام شعری مجموعوں میں چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ سندھ ساگر کے ساتھ رومانس کے حوالے سے اُن کی ایک نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

"دریا او دریا، پاݨی تی ڈے ڈونگھے
توں ساڈا ایپوماء، اساں تی ڈے پونگے "(۱۱)

دریائے سندھ سے محبت اور عقیدت کے حوالے سے اشولال کی ساری شاعری بھری پڑی ہے۔ سندھ وادی سے رومان کا یہ سفر اشولال کی شاعری میں اپݨا عروج کو پہنچتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر زبان میں کسی نہ کسی عہد میں رومانوی فکر ایک غالب رجحان کی صورت اُبھری ہے۔ سرائیکی زبان میں رومانویت کا آغاز ۱۹۸۹ میں اشولال کی کتاب "چھیڑ وہتھ نہ مرلی" اور رفعت عباس کی کتاب "پڑچھیاں اُتے بُھل" سے اپݨی پوری توانائی سے شروع ہوتا نظر آتا ہے اور سرائیکی زبان میں یہ رومانوی عہد اشولال اور رفعت عباس کے مذکورہ دو شعری مجموعوں سے شروع ہوتا ہوا آج تک جاری ہے۔ اور یہی ۱۹۸۹ء سے لیکر موجودہ عہد ۲۰۲۴ء کا سرائیکی شاعری کا دور خاص طور پر نظم گوئی کا عہدِ زریں بھی ہے۔ اشولال کے علاوہ بہت سارے شاعروں نے سندھ وادی اور اس کے دریاؤں کے حوالے سے بھرپور رومانوی شاعری کی ہے۔ رفعت عباس نے اپنی نظموں جدید رومانویت کی بنیاد رکھی ہے۔ سندھ وادی کے دریاؤں کے حوالے سے اور اس کے وسیب کے حوالے سے ایک نئی قسم کے رومان کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح جدید نظم گو شاعروں نے سندھ وادی اور اس کے دریاؤں سے اپݨی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے جہاں سندھ وادی کے قدیم آثار سے اپنے رومان کوں شعری قالبوں میں ڈھالا ہے وہیں ان دریاؤں کے گم ہونے، خشک ہونے، آلودہ ہونے اور بیچ دیئے جانے کے دکھ اور درد کے نوحے بھی لکھے ہیں اور جدید سرائیکی نظم میں ان دریاؤں کی خوبصورتی اور رعنائی کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔

سندھ وادی سے رومان کا سب سے بڑا حوالہ دریائے سندھ ہے۔ ستلج، راوی، چناب کے ساتھ ساتھ سندھ وادی کے ایک گم ہو جانے والے دریا "ہاکڑہ" سے محبت بھی ایک بڑے رومان کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ دریائے ہاکڑہ کو گھاگھرا اور سرسوتی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اشولال کے علاوہ جن سرائیکی نظم گو شاعروں کی نظموں میں یہ رومان بھرپور طور پر ابھرا ہے اُن میں ایک نام سعید اختر سیال کا ہے جن کا شعری مجموعہ "دیرہ سندھ کنارے"(۱۹۹۱ء) ہے۔ اس شعری مجموعے کا عنوان اور اس میں شامل نظم "دریا" اور نظم "دیرہ سندھ کنارے" سندھ دریا سے رومان سے جڑی بہترین نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں سندھ وادی کے اس عظیم دریا کے حسن اور اس سے جڑی شعری جمالیات سعید اختر سیال نے کمال خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ نظم دریا سے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

تُوں تاں ہیں دریاوے سائیں
تی ڈے جیوݨ رُوپ کُوں ڈیہدے
جندو وچ پوندے ساہ وے سائیں

واہ وے سائیں"(۱۲)

اسلم جاوید کی مزاحمتی شاعری کی شعری جمالیاتی میں سندھ وادی کے عظیم دریاؤں کا حوالہ بھی سندھ وادی سے اُن کے رومان کا ہک بہترین حوالہ ہے۔اُن کی مختصر نظم میں اُن کا یہ رومانس صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

"میں ترسا
می ڈٖیی دھرتی ترسی
ترسی روہی ںائی
میکوں آکھ نہ پنج دریائی(۱۳)

اسی طرح مظہر عباس تابش کا شعری مجموعہ "ٹھیڑیاں" بھی سندھ وادی سے رومان کے حوالے سے ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ ٹھیڑیاں کا مطلب ہے آثار۔ خرابے، کھنڈرات، ویران شدہ بستیاں۔ اس شعری مجموعہ میں ٹھیڑیاں کے عنوان سے ۱۹ مختصر اور معنی خیز نظماں شامل ہن۔ جن میں سندھ وادی کے آثار کے حوالے سے شاعر نے اپنے رومان کو بیان کیا ہے۔ ان نظموں میں ٹھیڑی سے خطاب بھی ہے۔ اوران ٹھیڑیوں سے متعلق مظہر علی تابش نے اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان سب نظموں میں غنائیت اور سرشاری پائی جاتی ہے۔ ان میں درد اور ایک کسک سی بھی موجود ہے۔ یہ کسک ٹھیڑیاں کے عنوان سے لکھی جانے والی ان نظموں کے سلسلے کی آخری نظم سندھ وادی اور اس کے آثار سے رومان کے حوالے کی ہک شاہکار نظم ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

"قبر کھٹ آ"
بھلا ہووی اساڈٖی من چا
ہولے ہولے مٹی کھٹیں
پھنبڑیاں پھنبڑیاں سلہیں پٹیں
ہک ہک سلھ دے ہیٹھ اساڈٖے
پُرکھاں دی تہذیب پئی ہِ
ہتھ لاویں تاں ہَولا لاویں
کیوں جو اَہدن ٹھیڑی ٹھیڑی
موئے بندے دا انگ انگ
ڈٖاہڈا درد کریندے"(۱۴)

اس نظم کا مخاطب قبر کھودنے والا ہے جس سے مراد آثار قدیمہ والے وہ لوگ ہیں جو آثار کی کھدائی کرتے ہیں۔

خالد منیر خالد کا شعری مجموعہ "سندھڑے لہندی شام" میں سندھ وادی اور دریائے سندھ سے رومان اس شعری مجموعے کے عنوان "سندھڑے لہندی شام" اور اس کتاب کے انتساب سے صاف نظر آتا ہے۔ کتاب کا انتساب کچھ یوں ہے:

"سندھ وادی دے حسن دے ناں"(۱۵)

اس شعری مجموعہ کی نظم "سندھڑے لہندی شام" منیر احمد منیر کا سندھ وادی سے رومان کا ایک خوبصورت شعری اظہار ہے۔ خالد منیر خالد کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

"میکوں قرب کنارڈٖے ہِئی
سندھڑے لہندی شام
موسم پیار اپیار اڈٖے ہِئی
سندھڑے لہندی شام
ڈٖینہہ تاں اکھیاں روندیں روندیں

رستہ بھال گزاریا
چھیکڑ!خوب ٹھکارا ڈے°ئی
سندھڑے لہندی شام" (۱۶)

جاوید آصف کا شمار بھی جدید سرائیکی شاعری کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ "وساندر "۲۰۱۵ء میں چھپ کر سامنے آیا توں اس میں ایک نظم "پچھتاوا" کا موضوع دریا سندھ کا نوحہ ہے۔ سندھ دریا کو جس طرح سے آلودہ کیا گیا ہے اور اس کے قدرتی حسن کو جس طریقے سے بگاڑا گیا ہے اس سب کے دکھ اور درد کو بیان کرتے ہوئے جاوید آصف نے اپنے پشمانی اور پچھتاوے کوں یوں بیان کیا ہے:

"سندھو سائیں
تی ڈِی وسوں
بے شک ساڈے ہتھوں اُ·ڑی
تی ڈِے بیلے
ساڈے ہتھوں بے کھوندے تھئے
تی ڈِی کاوڑ توں بے چنتے
تی ڈِی چپ دی شہ تے اساں
لئی لاٹے دی منزل تاٹ ی
تی ڈِے ہِک ہِک وٹ کوں ماریا
اے وی سوچ ک ڈِاہیں ساڈے چیتے نہ ائی
تی ڈِی کاوڑ ساکوں اتنا مہنگی پوسی "(۱۷)

سندھ دریا کی آبادی، اس کے جنگل، اس کے بیلے اور اس کے تمام حسن کی بربادی کی ذمہ داری کو قبول کرنا اور پھر دریا سندھ کی بپھری لہروں اور طغیانیوں کا بیان بھی سندھ وادی کے اس عظیم دریا سے رومان کا ہک خوبصورت حوالہ ہے۔ جو اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔

جہانگیر مخلص کا شمار سرائیکی زبان کے اُن رومانوی شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں رومانویت کے مزاحمتی عنصر کوں بہت ہی شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی سندھ وادی کے دریاؤں کے ساتھ جڑے رومان کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ان کے شعری مجموعہ "می ڈِاکوٹ ڈیرا اور جاگ ولا "(۲۰۱۹ء) کی نظم "سندھ طاس معاہدہ "سندھ وادی سے رومان کا ایک بہترین حوالہ ہے۔ نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

"می ڈِاسوہٹ استلج سائیں
توں نی وکیا!
تیئں ہکڑہ، سرسوتی تے
سُک بیاس دے وانگوں
مونہہ نی موڑیا
ساہ نی تروڑیا
می ڈِا ستلج سائیں
توں نی وکیا! (۱۸)

جہانگیر مخلص کا کہنا ہے کہ اس معاہدے سے ستلج نی بیچا گیا بلکہ اس کے ساتھ اس کے بیٹ، بیلے، جھوپڑ جاہ ٹھکانے، اس میں رہنے والے کیہل مور، مہانے، اس کی زمین کے دھوئیں، بارشیں، لسی، مکھن، دہی، سب ختم ہو گئیں۔ اس کے بکنے سے یہاں کے لوگوں کی شاخ، ان کی قسمت کی لکیریں، ان کی جاگیریں، آنے والی نسلیں، اس

دھرتی کی فصلیں سب بک گئے ہیں، ستلج اکیلانی بِکا بلکہ اس کے ساتھ یہاں کے پرندے، اُن کی بولیاں، یہاں کی لوریاں، یہاں کی کشتیاں، یہاں کی آنکھیں اور ان کا نور بک گیا ہے، اس دریا کی من کے قصے اور قصے سنانے والے قصولی بھی کہیں گم ہو گئے ہیں۔ یہاں کے ناچ، ناچنے والے سب کھو گئے ہیں۔ ان کا ماتم اب کون کرے۔ نظم کا اختتام بہت ہی دلخراش ہے نظم کے اختتامی اشعار ملاحظہ ہوں:

"کون ھے جو رُل گئیں دے نانویں
کانے ٭دھے، ٹوٹھے تارے
کئی تاں پرلی کندھی کھڑتے
وی ن٘ ولاوے، ہکلاں مارے
می ڈ٘ا سوہن٘ ا ستلج سائیں!
می ڈ٘ا سوہن٘ ا ستلج سائیں! (سندھ طاس معاہدہ، ص:۱۲۴)

اس شعری مجموعہ "می ڈ٘ا کوٹ ڈیر اور جا°ولا" مجموعے کی ایک اور نظم "سنجان٘ "میں بھی سندھ وادی کے اہم مرکز کے حوالے ایک بہترین رومانوی نظم ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

"اساں مٹی واس نمان٘ ے ہیں
ساڈ٘ یاں ریتاں پیت پرستیاں ہن
ساڈ٘ ی بھوئیں تے ہاکڑہ واہندا ھا
ساڈ٘ یاں ستلج سانویں ہستیاں ہن
ساڈ٘ اکوٹ ڈیر اور جا°ندا ھا
ساڈ٘ یاں پتن منارے وسیتاں ہن
ساڈ٘ ا اُچ ملتان مسیند ا ھا
کیا موجاں ہن کیا مستیاں ہن
ہن٘ میسے مستک پڑھ ساڈ٘ ے
رُل °ئیں دیاں ذاتاں کیا پچھدیں؟
اساں چھکیڑی ساہ ہیں روہی دے
ساڈ٘ یاں عید ابر اتاں کیا پچھدیں؟" (سنز٭ان٘ ، ص:۱۲۵)

پوری نظم میں سندھ وادی کے اہم ترین مقامات کے آثار کے ختم ہو جانے کا دکھ ایک ماتمی دھن کی صورت دل اور روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ جہانگیر مخلص کی شاعری میں موجود سندھ وادی سے رومان بہت دکھی کر دینے والا اور رُلا دینے والا ہے۔

سرائیکی زبان کے مشہور مزاحمتی شاعر عاشق بزدار نے جہانگیر مخلص کے شعری مجموعہ "می ڈ٘ا کوٹ ڈیر اور جا°ولا" میں لکھے اپنے تقریظی مضمون میں اس نظم "سندھ طاس معاہدہ" کوں دریائے ستلج کا نوحہ قرار دیا ہے۔ جدید نظم لکھنے والے نوجوان لکھاریوں میں مخمور قلندری اور اظہر کلیانی کے شعری مجموعوں میں بھی سندھ وادی کے رومان سے بھری نظمیں موجود ہیں۔ جدید سرائیکی نظم کے علاوہ کافی، غزل اور ڈ٘وہڑے کی شعری اصناف میں اقبال سوکڑی، احمد خان طارق، نصر اللہ خان ناصر، عاشق بزدار اور رفعت عباس وہ بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری میں سندھ وادی اور اس کے دریاؤں کا رومان موجود ہے۔

جدید سرائیکی شاعری میں سندھ وادی ایک بہت بڑے رومان کے طور پر ابھری ہے۔ اس رومان (Romance) کے پیچھے ہک بہت بڑا فخر (Pride) کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ فخر سرائیکی وسیب کو سر جان مارشل اور کننگھم کے اُن آثار کی دریافت کے بعد ملا ہے جن کے توسط سے ہڑپہ، موہنجوداڑو اور ملتان سے ملنے والے آثار سے سندھ وادی کا شمار دنیا کی چار بڑی تہذیبوں میں ہوا ہے۔ جدید سرائیکی شاعروں نے اس فخر کوں اپن٘ ی نظموں میں جس طرح سے سراہا اور منایا ہے اُس سے یہ فخر سرائیکی شاعری میں سندھ وادی کے آثار، سندھ وادی کی اساطیر، اس کے دریاؤں، ان دریاؤں سے متعلق انسانوں، پرندوں، پودوں اور دریائی مخلوق اور اس کے قدیم شہروں خاص طور پر

ملتان سے محبت جدید سرائیکی شاعروں کے لئے ایک بہت بڑے رومان کے طور پر کھڑی نظر آتی ہے۔ سندھ وادی کی اس تہذیب سے محبت کا اظہار خواجہ غلام فرید سے شروع ہوتا ہوا جدید سرائیکی شاعری کے سب بڑے شاعر اشولال اور رفعت عباس کی شاعری میں اپڑے عروج کوں پہنچتا نظر آتا ہے اور پھر بعد میں نوجوان شاعروں کی نظماں میں بھی ان کا رومانس ایک بہت بڑے موضوع اور فخر کے طور پر نسل در نسل منتقل ہوتا نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وھیلر، مورٹیمر، سر، وادیِ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں، (مترجم) زبیر رضوی، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان،، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۸ء، ص:۱۲

۲۔ نوید اسلم، شیخ، پاکستان کے آثارِ قدیمہ، لاہور، بک ہوم، ۲۰۲۰ء، ص:۳۳

۳۔ اکرم میرانڑی، سرائیکی ڈیس، لاہور، نگارشات، ۱۹۸۷ء، ص:۱۲

۴۔ عتیق انور صدیقی، ڈاکٹر، ہندوستانی وراثت اور آثارِ قدیمہ، دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص:۵۰

۵۔ وھیلر، مورٹیمر، سر، وادیِ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں، ص:۱۲

۶۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر، سرائیکی لوک گیت، ملتان، بزم ثقافت، ۱۹۶۴ء، ص:iv

۷۔ گردیزی، حسن رضا، دھابے دھوڑے، ملتان، بزم ثقافت، ۱۹۷۹ء، ص:۵۷

۸۔ رسول پوری، جمشید احمد کمتر، سُکھ سوجھلا، جام پور، نیلاب پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص:۶۸

۹۔ عاشق بزدار، قیدی تخت لہور دے، ملتان، جھوک پبلشرز، طبع دوم ۲۰۱۴ء، ص:۲۹

۱۰۔ اشولال، سندھ ساگر نال ہمیشاں (درشن۔۔۱)، لہور، شرکت پریس، ۲۰۰۲ء، ص:۸

۱۱۔ اشولال، سندھ ساگر نال ہمیشاں (ڈوجھا درشن)، سپت سندھو، دیرہ اسماعیل خان، ۲۰۱۷ء، ص:۱۷۱

۱۲۔ سیال، سعید اختر، دیرہ سندھ کنارے، ڈیرہ اسماعیل خان پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص:۵۱

۱۳۔ اسلم جاوید، میکوں آکھ نہ پنج دریائی، اسلام آباد، ورلڈ وائیڈ میڈیا کمیونی کیشن، ۱۹۹۴ء، ص:۳۰

۱۴۔ تابش، مظہر علی، ٹھیڑیاں، ڈیرہ اسماعیل خان، قاصر ادبی فورم، ۲۰۰۱ء، ص:۸۶

۱۵۔ خالد، منیر خالد، سندھڑے لہندی شام، ملتان، جھوک پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص:۳

۱۶۔ خالد، منیر خالد، سندھڑے لہندی شام، ملتان، جھوک پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص:۱۰۷

۱۷۔ جاوید آصف، وساندر، ملتان، دستک پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۱۴۹

۱۸۔ جہانگیر مخلص، میڈا کوٹ ڈیرا اور جا° ولا، ملتان، سرائیکی ایریا سٹڈی سنٹر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۹، ص:۱۲۲